FROM BARCELONA WITH LOVE

بارسلونا سے محبت کے ساتھ

لوگ کرسٹوفر کولمبس کو امریکہ دریافت کرنے کی وجہ سے جانتے ہیں لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ وہ اسپین کے لیے کیا کچھ لے کر آیا۔ میں کولمبس تو نہیں ہوں مگر ۱۹۹۱-۹۲ میں یورو-انڈیا ایکسچینج پروگرام کے تحت ESADE بارسلونا کے اپنے سفر کی یادیں آج بھی ستائیس برس بعد مجھے یہ احساس دلاتی ہیں کہ بیرونِ ملک ایک مختصر سفر بھی انسان کو کتنا کچھ دے سکتا ہے۔

ا۔ سسٹر کونچیتا

جب بھی میں بارسلونا کو یاد کرتا ہوں سب سے پہلے سسٹر کونچیتا کا خیال دماغ آتا ہے۔ وہ بارسلونا میں میری منہ بولی بڑی بہن تھی۔ میں نے کبھی ایسی بہن نہیں دیکھی جو اتنی محبت کے ساتھ مگر اتھارٹی کے انداز میں بات کرتی ہو۔ وہ ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں اور ڈائریکٹر جنرل کی پرسنل سیکریٹری تھی۔ جو مختلف یورپی زبانوں میں روانی سے بات کرسکتی تھی اور مختلف ممالک سے آنے والی فون کالز کا جواب بآسانی دیتی تھی ایک مرتبہ میرا ایک فیکلٹی دوست جوروٹرڈیم سے مجھ سے ملنے آرہا تھا (وہ جیرونا ریلوے اسٹیشن پر اپنا سوٹ کیس بھول آیا، فرانس سے اسپین کی طرف سفر کے دوران) سسٹر کونچیتا نے صرف بارہ گھنٹوں کے اندر وہ سوٹ کیس واپس حاصل کروادیا۔

دسمبر ۱۹۹۱ کے وسط میں جب میں اسپین کی وزارتِ خارجہ سے رہائشی اجازت نامہ حاصل کرنے کے سلسلے میں ان سے بات کر رہا تھا (کیونکہ ان دنوں اسپین تین ماہ سے زیادہ قیام کا ویزا جاری نہیں کرتا تھا)، تو میں نے ان سے کہا کہ مجھے یہ جلدی چاہیے کیونکہ اس کے فوراً بعد مجھے برطانیہ جانا ہے۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور پوچھا ''کیا تم اسی حالت میں جارہے ہو''؟ میں حیران رہ گیا تو انہوں نے میرے پمپ شوز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''میں تمہیں اس طرح نہیں جانے دوں گی۔ آج دفتر کے بعد ہم دکان جائیں گے اور تمہارے لیے مناسب جوتے خریدیں گے۔ تم سردی سے جم جاؤ گے میرے دوست'' ان کی اس محبت بھری توجہ نے مجھے یہ احساس دلایا کہ بارسلونا میں بھی میری ایک بہن موجود ہے جو میرا خیال رکھتی ہے۔

ایک شام جب میرا خاندان ہندوستان سے میرے پاس بارسلونا پہنچا تو سسٹر ہم سے ملنے آئیں۔ میری بیوی اس وقت رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ سسٹر نے مجھ سے پوچھا ''یہ کیا کرتی ہیں''؟ میں نے نہایت ادب سے جواب دیا ''یہ گھریلو خاتون ہیں''۔ وہ میری بات نہ سمجھ سکی۔ دوبارہ پوچھنے لگی ''میں بھی گھریلو خاتون ہوں مگر یہ کرتی کیا ہیں''؟ تب مجھے ان کے پورے دن کی مصروفیات بیان کرنی پڑی۔ میں نے کہا ''یہ صبح ساڑھے پانچ بجے جاگ جاتی ہیں۔ تیار ہونے کے بعد ہماری

دوسری بیٹی کو اسکول کے لیے تیار کرتی ہیں اور دونوں بچیوں کو تقریباً ساڑھے سات بجے اسکول بھیجتی ہیں۔ پھر میرے لیے ناشتہ تیار کرتی ہیں۔ جب میں ساڑھے آٹھ بجے نکل جاتا ہوں تو میرے والد کے لیے ناشتہ بناتی ہیں۔ ساڑھے نو بجے کے آس پاس خود ناشتہ کرتی ہیں۔ اس کے بعد دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ بجے میں واپس آتا ہوں اور والد صاحب کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں۔ بچیاں ڈھائی بجے واپس آتی ہیں۔ چھوٹی بیٹی کو کھانا کھلانے کے بعد یہ خود کھانا کھاتی ہیں۔ تب تک تقریباً پونے چار بج چکے ہوتے ہیں۔ پھر برتن صاف کرنے والی ملازمہ آتی ہے اس کے بعد یہ سب کے لیے شام کی چائے تیار کرتی ہیں۔ شام ساڑھے چھ بجے رات کے کھانے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ رات ساڑھے نو بجے میں والد صاحب کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں اس کے بعد یہ خود کھانا کھاتی ہیں۔ جب تک یہ سب کام ختم ہوتے ہیں رات کے گیارہ بج جاتے ہیں''۔ میں نے اپنی بات ختم کی۔

''کیا؟ پورا دن صرف کھانا پکاتی رہتی ہیں''؟ مسز حیرت سے بولی۔ ''پروفیسر، آپ اپنی بیوی کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔ آپ ایک ڈیپ فریزر کیوں نہیں خرید لیتے ان کے لیے؟ وہ صبح ہی سارا کھانا تیار کر کے رکھ سکتی ہیں اور شام کو صرف گرم کر لیا کریں بجائے اس کے کہ پورا دن کھانا پکاتی رہیں''۔ میں نے کہا ''میں آپ کی بات سے متفق ہوں مگر ایک مسئلہ ہے۔ اس کے لیے بجلی چاہیے''۔ انہوں نے حیرانی سے پوچھا ''کیا آپ کے یہاں بجلی نہیں ہے''؟ میں نے جواب دیا ''بجلی تو ہے مگر یہ معلوم نہیں ہوتا وہ کب آئے گی''۔ بارسلونا جیسی جگہ جہاں نو ماہ کے قیام کے دوران مجھے ایک بار بھی بجلی کے جانے کا سامنا نہیں کرنا پڑا وہاں کی ایک خاتون کے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل تھا کہ ۱۹۹۰ کی دہائی میں اتر پردیش جیسے پسماندہ ریاست میں بجلی کا کیا مطلب تھا۔

۲۔سی ای ایم ایس

ESADE کے ڈائریکٹر جنرل Community of European Management Schools کے چیئرمین تھے (جس کو آج عالمی اتحاد برائے انتظامی تعلیم کے نام سے جانا جاتا ہے)۔ اس تنظیم کے ۳۱ تعلیمی اراکین ہیں اور یہ ہر ملک سے صرف ایک مینجمنٹ ادارے کو رکنیت دیتی ہے۔ ۱۹۹۲ میں ہندوستان واپس آنے سے پہلے میں نے ان سے اشتراکِ عمل کے امکانات پر گفتگو کی۔ انہوں نے صلاح دی کہ ہم دو سال کے لیے بطور مہمان رکن شامل ہو جائیں کیونکہ اُس وقت ہندوستان کا کوئی مینجمنٹ ادارہ اس تنظیم کا رکن نہیں تھا۔ وہ دو سال تک ہماری کارکردگی دیکھنے کے بعد ہمیں تنظیم مکمل رکنیت بھی دے سکتی تھی۔ بدقسمتی سے ڈائریکٹر اور دیگر ذمہ داران نے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی اور ہم یہ موقع کھو بیٹھے۔ بالآخر ۲۰۱۲-۱۳ میں آئی آئی ایم کولکتہ کو میرے دوست پروفیسر شیکھر چودھری کی ڈائریکٹرشپ میں اس کی رکنیت حاصل ہوئی۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کم ازکم ہندوستان کا کوئی مینجمنٹ ادارہ یورپی مینجمنٹ اداروں اور صنعتوں کے اس عالمی نیٹ ورک کا حصہ بن گیا۔

۳۔ باہمی تعاون

جب میں ESADE گیا تو میرا ارادہ انضمام وحصول ایم اینڈ ای کے موضوع پر کیس رائٹنگ لکھنا تھا مگر ڈین سے ملاقات کے بعد جلد ہی مایوسی ہوئی کیونکہ اُس وقت کے ڈین نے کہا ''ہم اس شعبے کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ابھی تک کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوسکی''۔ تاہم میں ESADE کے ایک ڈاکٹر فیکلٹی ممبر کی یادداشتوں کی بنیاد پر مشترکہ طور پر تین حصوں پر مشتمل ایک کیس اسٹڈی تیار کرنے میں کامیاب رہا۔ اسی طرح ایک ممتاز پروفیسر ایمل کے ساتھ مل کر ''ہندوستان کو کاروباری شراکت دار کے طور پر یورپی ایگزیکٹوز کے تصورات'' کے موضوع پر ایک کثیر ملکی تحقیقی منصوبہ بھی تیار کیا جو ہندوستان واپس آنے کے بعد مکمل ہوا۔ تیسرا تحقیقی منصوبہ پروفیسر ویدما اور ولاہور کے ساتھ مل کر In Search of Excellence کی طرز پر ایک مطالعے کی نقل تیار کرنے کا تھا۔ اس منصوبے کے لیے سوالنامہ بھی تیار ہو گیا تھا مگر بدقسمتی سے اس پر عملی کام شروع نہ ہوسکا۔ چوتھا منصوبہ ایک یورو-انڈیا مینجمنٹ سینٹر کے قیام کی تجویز تیار کرنا تھا جو مارکیٹنگ کے پروفیسر موتانیا کے اشتراک سے مکمل ہوئی۔ آج بھی یہ بات میرے لیے حیرت کا باعث ہے کہ صرف نو ماہ کے مختصر عرصے میں ایک ایسے ملک میں جہاں میں کسی کو جانتا نہیں تھا میں نے چار مختلف شعبوں میں چار مختلف پروفیسروں کے ساتھ شراکت داری قائم کرتے ہوئے چار منصوبوں پر کام کیا مگر آئی ایم ایکس میں پانچ سال قیام کے باوجود میں ایک بھی مشترکہ منصوبہ تیار نہ کرسکا۔ کیا کمی مجھ میں تھی یا اس کے پیچھے کچھ سماجی اور ثقافتی عوامل کارفرما تھے جو اس نوعیت کے اشتراک کی راہ میں رکاوٹ بنتے تھے؟

۴۔ کیسیو، کیٹل اور ریکارڈر

بارسلونا ایک ایسی جگہ تھی جہاں میں تقریباً اجنبی تھا۔ اُن دنوں وہاں انگریزی زبان عام نہیں تھی۔ میں ایسی جگہ اس لیے گیا تھا کیونکہ پی جی پی چیئر مین کے طور پر اپنی مدت ختم ہونے کے بعد میں ذہنی اور جسمانی طور پر اس قدر تھک چکا تھا کہ لگتا تھا جیسے کسی بھی لمحے ٹوٹ کر بکھر جاؤں گا۔ میں اپنا اعتماد کھو چکا تھا اور سفر کرنا بھی ترک کر دیا تھا۔ ایک دن مجھے محسوس ہوا کہ اس طرح زندگی گزارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اُس وقت میری عمر تقریباً پینتالیس برس تھی میرے بچے ابھی اسکول میں پڑھتے تھے اور مجھے یہ فکر ستاتی رہتی تھی کہ اگر واقعی مجھے کچھ ہوگیا تو ان کا کیا بنے گا۔ اسی لیے جب ڈائریکٹر نے مجھے بیرونِ ملک جانے کو کہا تو میں نے جان بوجھ کر ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں میں کسی کو نہ جانتا تھا اور نہ ہی وہاں کی زبان سے واقف تھا۔ لیکن بعد میں وہی سفر میری زندگی کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔

(الف) کیسیو

ادارے کے اوقاتِ کار کے بعد شام اور ہفتہ وار تعطیلات میں وقت کیسے گزارا جائے؟ ایک دن سمندر کی طرف پیدل جاتے ہوئے میری نظر ایک دکان میں رکھے ہوئے Casio پر پڑی جس کی چابیاں ہارمونیم جیسی تھی۔ میں نے وہ خرید لیا اور اسے بجانا شروع کر دیا کیونکہ وہاں کوئی ایسا نہیں تھا جو اعتراض کرتا۔ کچھ ماہ میں ہی، میں کچھ گانے بجانے سیکھ گیا اور مجھے یہ سمجھ آنے لگا کہ راگ کیا ہوتا ہے۔ یہ بھی سمجھ آیا کہ نوشاد، سی۔ رام چندرا، شنکر جے کشن، وسنت دیسائی وغیرہ کے موسیقی کے انداز کیوں ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد محسوس ہوتی ہے۔ افسوس ہندوستان واپس آنے کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔

(ب) کیٹل

میرا دوسرا ساتھی ایک برقی کیٹل تھی۔ مجھے چائے کا نشا تھا۔ اُن دنوں لکھنؤ ہندوستان میں برقی کیٹل خریدنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ برقی کیٹل کے لیے بجلی درکار تھی اور اُس زمانے میں بجلی کی مسلسل فراہمی کا یقین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ کیٹل میرے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی کیونکہ ڈپارٹمنٹل اسٹورز میں ٹی بیگز، دودھ کا پاوڈر اور چینی کے گولے آسانی سے دستیاب تھے اور میں با آسانی چائے تیار کر لیتا تھا۔

ایک طرح سے یہی کیٹل ڈاکٹر مانیل پیرو کی یادداشتوں پر مبنی پارک تاؤلی کیس سیریز کی تیاری میں بھی معاون ثابت ہوئی۔ لائبریرین نے مجھے رات بھر کے لیے انگریزی کا تالان لغت ایک رات کے لیے لینے کی اجازت دی۔ کمپیوٹر سینٹر کے سربراہ مورس نے مجھے ایک لیپ ٹاپ دیا جو ۱۹۹۱ میں میرے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ انتظامی افسر نے کرائے پر کیبل ٹی وی دلوانے میں مدد کی۔

ہر رات میں کھانا کھانے کے بعد چائے سے بھرا ایک تھرمس تیار کرتا، ٹی وی چلا دیتا (جو رات دو یا تین بجے تک چلتا رہتا تھا) اور بستر پر بیٹھ جاتا۔ پھر یادداشتوں میں سے ایک لفظ منتخب کرتا اور لغت میں اس کا مطلب تلاش کرتا جس کے انگریزی میں دو سے سات تک معنی نکلتے۔ پھر اگلا لفظ اور پھر اگلا۔ اس کے بعد پورے جملے کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کرتا کہ انگریزی میں اس کا مفہوم کیا ہوسکتا ہے۔ پندرہ دن بعد میں ایک صفحہ ترجمہ کرنے کے قابل ہوگیا اور اسے ڈاکٹر پیرو کو بھیجا تا کہ وہ دیکھ لیں کہ میرا اندازہ صحیح ہے یا نہیں۔ انہوں نے میری بہت مدد کی، میری غلطیوں کو درست کر کے۔

جب تقریباً پانچ صفحات مکمل ہو گئے تو کئی الفاظ جانے پہچانے سے لگنے لگے اور ترجمے کی رفتار تیز ہوگئی۔ ایک ماہ بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس کیس میں جو کچھ ہو رہا ہے ویسا کچھ میں زندگی میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ آہستہ آہستہ خیال آیا کہ کچھ اسی طرح

کے حالات ۱۹۷۲-۷۴ء میں HE(I)L BHEL کے آپس میں ضم ہونے کے دوران پیدا ہوئے تھے جن کا میں خود گواہ رہ چکا تھا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا "میرے خدا" ہندوستان میں دو سرکاری انجینئرنگ کمپنیوں کا ضم ہونا، اور یہاں اسپین میں ہزاروں کلومیٹر دور چار خسارے میں چل رہے اسپتالوں کا ضم ہوجانا مگر مسائل تقریباً ایک جیسے"۔ اسی احساس کے ساتھ اگلے ڈیڑھ ماہ میں تین حصوں پر مشتمل کیس سیریز کا مسودہ تیار ہوگیا۔ ڈاکٹر پیرو مجھے سابادل کے اسپتال لے گئے اور اُس سے وابستہ افراد سے متعارف کروایا۔ اگلے پندرہ دنوں میں کیس کو حتمی شکل دی گئی، منظوری ملی اور ایک ماہ بعد تدریسی نوٹ کے ساتھ اسے EICEP کے اختتامی سیمینار کے لیے EFMD بھیج دیا گیا۔ آج بھی میں سوچتا ہوں کہ شاید کیٹل نہ ہوتی تو یہ سب ممکن نہ ہو پاتا۔

(پ) ریکارڈر

سڑکوں پر چلتے ہوئے میری توجہ Sanyo کے ایک چھوٹے سے صوتی متحرک پاکٹ ریکارڈر کی طرف گئی۔ ابتدا میں میرا خیال تھا کہ میں اس پر کیسیو پر بجائی گئی اپنی دھنیں ریکارڈ کروں گا مگر اس نے میری زندگی میں بالکل مختلف کردار ادا کیا۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد مجھے ایک نئی سیکریٹریل اسسٹنٹ ملی۔ جب میں ان کو Dbase اور Merge Mail کی تربیت دے رہا تھا تو اتفاقاً میں نے بیرونِ ملک ہندوستانی کاروباری منصوبوں سے وابستہ کچھ کمپنیوں کو کیس رائٹنگ کی اجازت کے لیے پچھتر خطوط ارسال کر دیے۔ ان میں سے چار کمپنیوں نے مثبت جواب دیا۔ میں نے ان میں سے دو کمپنیوں کے اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقات بھی کی تا کہ کام کا آغاز کیا جاسکے مگر عین اسی وقت میری بیٹی بیمار ہوگئی اور مجھے سفر معطل کرنا پڑا۔ فنانس کے شعبے سے تعلق رکھنے والے میرے ایک بزرگ ساتھی پروفیسر ورشنیا جو دہلی سے آرہے تھے رضامند ہوگئے کہ وہ ایگزیکٹوز کے انٹرویوز کریں گے اور گفتگو کو ریکارڈ کریں گے اور دیگر معلومات جمع کریں گے۔ ہم نے ان ریکارڈنگز کو تحریری شکل دی اور ایک ابتدائی مسودہ تیار کیا۔ پھر میں نے معلومات کو ازسرِ نو ترتیب دیا اور ایک تدریسی نوٹ تیار کیا۔ پروفیسر ورشنیا اس بات پر خوشی سے حیرت میں مبتلا تھے کہ وہ مشترکہ طور پر دو اہم کیس اسٹڈیز "سمن انڈسٹریز اور گروتھ فارماسیوٹیکلز" کی تیاری میں شریک رہے۔ یہ دونوں کیس اسٹڈیز ۱۹۹۱ میں ہندوستانی معیشت کے کھلنے کے بعد بیرونِ ملک ہندوستانی کاروباری منصوبوں میں سے ایک کے پسپائی اختیار کرنے اور دوسرے کے بین الاقوامی توسیع کے موضوع پر تھی۔ یہ آئی ایم ایکس میں اس موضوع پر تیار ہونے والی پہلی دو کیس اسٹڈیز تھے۔

کیسیو، کیٹل اور ریکارڈر ان تینوں دوستوں جنہوں نے بارسلونا میری مدد کی؟ میں ایک بات مشترک ہے یہ آج بھی زندہ ہیں، فعال ہیں، اور میری قابلِ فخر ملکیت ہیں۔ سبکدوشی کے پچیس سال بعد بھی میں انہیں استعمال کر رہا ہوں۔ یہ اُس دور کی

ہندوستانی مصنوعات کی ایک نمایاں خصوصیت تھی دیرپا اور مضبوط صارف اشیا۔ اُن دنوں ہندوستان میں پائیداری کا ایک تصور عام تھا ''دادا لے، پوتا برتے'' (یعنی جو چیز دادا خریدے، اسے پوتا بھی آرام سے استعمال کر سکے)۔ مگر گزشتہ پچیس برسوں میں متعارف ہونے والے ڈائنا مک آبسولیسنس کے تصور کی بدولت اب ہمارے پاس ایسی ہندوستانی اشیا تقریباً باقی نہیں رہیں۔

۵۔ پارک تاؤلی کیس کی ثمرات

کیس رائٹنگ کے کئی فوائد ہوتے ہیں، مگر پارک تاؤلی کیس نے جو کچھ مجھے دیا وہ واقعی بہت ہی اعلیٰ تھا تقریباً وہ سب کچھ جو ایک استاد اپنی علمی زندگی میں حاصل کرنا چاہتا ہے:

الف) ایک بین الاقوامی کیس اسٹڈی

ب) تدریسی نوٹ کا تحقیقی مقالے میں تبدیل ہو جانا

پ) بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت

ت) ایک کتاب کی اشاعت

ٹ) پی جی پی کورس کا آغاز

ث) ایک اہم ڈی پی کا آغاز

ج) ایک پیشہ ور تنظیم (Strategic Management Forum) کا قیام جس نے ان خوابوں کو حقیقت میں بدل دیا:

- بڑے پیمانے پر کانفرنسوں کا انعقاد
- اسٹریٹجک مینجمنٹ کے شعبے میں مینجمنٹ اداروں کے چھ سو سے زائد اساتذہ کی علمی و پیشہ ورانہ تربیت میں معاونت

۶۔ کورس کا مواد

ESADE میں قیام کے دوران مجھے اکثر (EFMD) سے رابطہ کرنا پڑتا تھا۔ وہاں میں نے یہ سیکھا کہ فیکس کے اخراجات کس طرح کم کیے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر چار خطوط کو ۶۳ فیصد سائز تک کم کر کے ایک A4 صفحے پر پرنٹ کیا جاتا اور پھر صرف ایک صفحہ فیکس کیا جاتا۔ یہیں سے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر چار A4 صفحات کو ۶۳ فیصد سائز میں کم کر کے ایک A3 ماسٹر شیٹ پر رکھا جائے اور اسے دونوں طرف سے فوٹو کاپی کی جائے تو کورس مواد کی لاگت، وقت اور افرادی قوت کی ضرورت میں نمایاں کمی کی جا سکتی ہے۔ اس سے بھاری بھرکم A4 سائز کورس مواد ایک ہلکی کتاب کی شکل اختیار کر سکتا تھا خصوصاً اُس صورت میں جب کورس کا مواد خود فیکلٹی ممبران تیار کریں۔

میں نے مرجر اینڈ ایکوزیشن کورس کے تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل پی جی پی کورس میٹیریل کو ایک مختصر اور قابلِ استعمال A4/2

سائز کتاب کی صورت میں تیار بھی کیا مگر بہت سے اساتذہ کے اس طریقہ کار کو اختیار نہ کرنے کی وجہ سے یہ کوشش آگے نہ بڑھ سکے۔

تاہم یہ خواب ستائیس برس بعد یعنی میری سبکدوشی کے سات برس بعد اُس وقت حقیقت میں تبدیل ہوا جب میں نے معیاری A5 (9"*"6) انچ سائز میں پندرہ کتابیں پیپر بیک اور ای۔ بک فارمیٹ میں ڈیزائن اور شائع کی۔ اگر ہم یہ کام ۱۹۹۲-۹۳ہی میں کر لیتے تو آئی ایم ایکس کے Perspective Plan ۱۹۹۲-۹۳ میں تجویز کردہ Academic Resource Park ملک میں مینجمنٹ تعلیم کے لیے درکار تمام کورس مواد تیار کر سکتے تھے۔

۷۔Qué más

دو الفاظ Qué más (اور کیا) آج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ لوگ یہ الفاظ (وہ بھی مسکراتے ہوئے) اُس وقت ادا کرتے تھے جب وہ آپ کا دیا ہوا کام مکمل کر لیتے تھے حتیٰ کہ دفتر بند ہونے کے وقت بھی۔ اُن کی مسکراہٹ اس قدر دلنشیں اور متعدی ہوتی تھی کہ انسان بے اختیار احترام سے اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ بارسلونا میں مجھے لگا کہ اگر کسی ملک کی خوشی ناپنے کا کوئی ایک پیمانہ(Index) ہوسکتا ہے تو وہ شاید یہ ہو کہ ایک شخص دن میں کتنی بار مسکراتا ہے۔ میں اس اندازِ عمل سے اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اپنے اہلِ خانہ اور دوستوں کے لیے اپنے دستخط تبدیل کر کے اب مشہور ایموجی 'Keep Smiling' اختیار کر لیا۔ میں نے خود بھی اس انداز کو اپنانے کی کوشش کی مگر میں جانتا تھا کہ میری مسکراہٹ بناوٹی تھی ویسی حقیقی اور بے ساختہ نہیں جیسی میں نے وہاں لوگوں کے چہروں پر دیکھی تھی۔

۸۔ ہندوستان ہمارے ذہن میں نہیں آتا

ایک مرتبہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ، جسے SDA Bocconi میں تعینات کیا گیا تھا حکومتِ کاتالونیا کے کمرشل آفس آف ٹیکنالوجی ٹرانسفر گیا۔ میں نے وہاں اُن سے پوچھا آپ ہندوستان کو کون سی ٹیکنالوجی منتقل کرتے ہیں؟ انہوں نے افسوس کے ساتھ جواب دیا ''ہندوستان ہمارے ذہن میں نہیں آتا''۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا اور پوچھا ''پھر آپ ٹیکنالوجی کہاں منتقل کرتے ہیں''؟ اس پر انہوں نے جواب دیا ''برطانیہ، فرانس، جرمنی وغیرہ''۔ میں حیران تو ہوا مگر بعد میں جب ایک تحقیقی مطالعے کے لیے اسپین کی نمایاں کمپنیوں کی نشاندہی کر رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہاں کئی چھوٹی کمپنیاں ایسی تھی جو اپنے مخصوص شعبے میں عالمی سطح کی رہنما کمپنیاں تھی حتیٰ کہ انڈیکس کے چوتھے ہندسے تک کی درجہ بندی میں بھی۔ اسی دوران Dun's Europa کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا جس میں یورپ کی کمپنیوں کے نام، پتے اور حجم درج تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ

کئی چھوٹی کمپنیاں اپنے محدود شعبوں میں عالمی رہنما تھی چونکہ وہ اتنی بڑی نہیں تھیں کہ انگریزی زبان کے بین الاقوامی تجارتی جرائد میں اشتہارات دے سکتیں اس لیے ہندوستانی اُن کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے اور نتیجتاً ہم ٹیکنالوجی اُن بڑی کمپنیوں سے درآمد کرتے تھے جنہیں یہ چھوٹی کمپنیاں خود اپنی ٹیکنالوجی فروخت کرتی تھیں۔ اگر ہمیں اُن کی زبانیں آتی تو ہندوستان اُن سے کہیں کم قیمت پر اور برابر شراکت دار کی حیثیت سے ٹیکنالوجی حاصل کر سکتا تھا۔

اگر ہندوستان اُن کے ذہن میں نہیں آتا تھا تو وہ بھی ہمارے ذہن میں نہیں آتے تھے۔ تب مجھے یہ احساس ہوا کہ تحقیق کے میدان میں ہم ایک دوسرے کے نہایت اہم شراکت دار بن سکتے تھے۔ ایک سوالنامے کا ترجمہ کروانے پر مجھے ۱۵۰ یورو خرچ کرنے پڑے جو اُس زمانے میں تقریباً چھ ہزار روپے بنتے تھے جبکہ ہندوستان میں ہم چودہ صفحات پر مشتمل ایک سوالنامہ فرانسیسی، جرمن اور ہسپانوی زبانوں میں تقریباً دو ہزار روپے میں ترجمہ کروا سکتے تھے۔ سیکریٹریل معاونت کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہاں فی سوالنامہ روزانہ کی لاگت ۱۰۰ یورو سے کم نہ تھی جبکہ یہاں میری سیکریٹری نے بغیر کسی اضافی معاوضے کے اسے ٹائپ کیا اور چار زبانوں میں دو ہزار لفافے بھی تیار کیے۔

اس طرح (ہندوستان کو کاروباری شراکت دار کے طور پر یورپی ایگزیکٹوز کے تصورات) کے موضوع پر وہ تحقیقی مطالعہ جس کے لیے ہمیں ایک ہزار یورو کی منظوری ملی تھی ہم نے محض دس ہزار روپے میں مکمل کر لیا۔ ہم تحقیق کے میدان میں بہت ہی عمدہ شراکت دار ثابت ہو سکتے تھے مگر افسوس کہ ہم نے اس نوعیت کے بے شمار مواقع گنوا دیے۔

ہندوستان واپس آنے تک میرے ذہن میں یورپ کے ساتھ باہمی مفاد پر مبنی تعلقات قائم کرنے کے کئی تصورات جنم لے چکے تھے۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ہندوستان میرے تحقیقی ساتھی ایمل کے مشورے کے مطابق عالمی سطح پر ایک فعال کردار ادا کرتے ہوئے بغیر کسی قومی مفاد کو نقصان پہنچائے اور بغیر ادائیگیوں کے توازن کو بگاڑے یورپ سے بہت کچھ حاصل بھی کر سکتا ہے اور اُسے بہت کچھ دے بھی سکتا ہے۔

۹۔ دھماکہ

ایک دن Avda Pedralbes سے گزرتے ہوئے میں نے ایک زوردار دھماکے کی آواز سنی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ کسی مراکشی مسلمان نے کیا ہے۔ اُس زمانے میں انگلینڈ اور آئرلینڈ کے درمیان کشیدگی بھی نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر عیسائی اور مسلمان اچھے ہمسائے بن کر نہیں رہ سکتے اگر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مذاہب ممالک کو تقسیم کر سکتے ہیں تو ہندوستان کتنا نازک ملک ہے جہاں ہر مذہب، ہر ذات، ہر زبان اور ہر علاقائی ثقافت اپنی جگہ اتنی ہی طاقت رکھتی ہے کہ ملک کو تقسیم کر سکے۔ میں لرز اٹھا ''کیا ہم ایک آتش فشاں پر بیٹھے ہوئے ہیں''؟ ہندوستان واپس آنے کے صرف چھ ماہ بعد

بابری مسجد گرادی گئی اور مذہبی انتہا پسندی کو ہوا ملی۔ اُس سے صرف ایک سال پہلے ریزرویشن کے مسئلے نے ملک کو بحران میں مبتلا کر دیا تھا تین ماہ تک ملک تقریباً مفلوج رہا اور آخر کار مرکزی حکومت گر گئی۔ میں سوچنے لگا کہ معاشی ترقی کے لیے اپنی آبادی کی قوت سے فائدہ اٹھانے کی خاطر ہندوستان کو جذباتی طور پر متحد کرنا کتنا دشوار مرحلہ ہے۔ کیا یہ ایک ایسا انتظامی چیلنج نہیں جو ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرے گا؟ اور کیا یہ ایک نوخیز جمہوریت کی غیر معمولی کامیابی نہیں کہ وہ ان تمام مشکلات کے باوجود متحد رہا؟

۱۰۔ ہندوستان میں موجود نعمتوں کا احساس

(الف) پانی

پہلا تجربہ پانی کے حوالے سے تھا۔ ہندوستان میں ہم روزانہ لیٹروں کے حساب سے پانی پیتے ہیں مگر جب جرمنی میں افتتاحی سیمینار کے دوران میں کھانے کے لیے جاتا تو نہایت احترام سے مجھ سے پوچھا گیا ''سر، آپ کیا لینا پسند کریں گے؟ وہسکی، وائن یا کافی''؟ جب میں پانی مانگتا تو وہ ایک چھوٹا سا پیگ بھر کر پانی پیش کرتے۔ ۲۵۰ سی سی پانی کی بوتل کی قیمت دو ڈالر تھی۔ خوش قسمتی سے ہم یورپی یونین کے مہمان تھے اس لیے رہائش اور کھانے کے اخراجات مفت تھے مگر پانی جیسی اضافی اشیا کی قیمت ہمیں اپنی جیب سے ادا کرنی پڑتی تھی جو ہمارے لیے آسان نہ تھا۔ آخر کار بعض لوگوں نے نل کا پانی پینا شروع کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر ہندوستان میں بھی پانی کی یہی قیمت ہوتی تو ہمارا کیا حال ہوتا؟

(ب) روٹی

قیمتوں کا یہی فرق دوسری اشیا میں بھی موجود تھا۔ ۱۹۹۱ میں نو مختلف اشیا کی قیمتوں کے تقابلی جائزے میں معلوم ہوا کہ بارسلونا میں قیمتیں ہندوستان کے مقابلے میں ۶. ۳ گنا ۵۰۰ (ملی لیٹر دودھ کی بوتل) سے لے کر ۱۲ گنا (ڈبل روٹی اور دو کمروں والے مکان) تک زیادہ تھیں۔ تب مجھے یہ احساس ہوا کہ فروختی قیمت کی بنیاد پر شمار کیا جانے والا GDP جس سے سہولت کے لیے امریکی ڈالر میں ظاہر کیا جاتا ہے دراصل ہندوستانی معیشت کی ایک نہایت مسخ شدہ تصویر پیش کرتا ہے۔

حقیقی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ایک الگ پیمانے کی ضرورت تھی اور بعد میں یہی تصور خریداری قوت کی برابری کی بنیاد پر تقابلی جائزوں کی صورت میں سامنے آیا۔

(پ) زبان کے اسباق

جیسا کہ میں نہ ہسپانوی جانتا تھا اور نہ ہی مقامی زبان اس لیے ESADE نے مجھے ہسپانوی زبان کی کلاسوں میں بھیج دیا۔

کلاس میں تقریباً بیس سال عمر کے پندرہ دیگر غیر ہسپانوی طلبہ بھی مختلف ممالک سے آئے ہوئے تھے۔ رنگوں کی وضاحت کرنے کے بعد استاد نے سیکھنے کا جائزہ لینے کے لیے ہر طالب علم سے پوچھا ''تمہاری گاڑی کا رنگ کیا ہے''؟ نوجوان طلبہ نے اپنے اپنے جواب دیے مگر ہندوستان کے آئی ایم ایکس سے آئے ہوئے ایک پروفیسر کی حیثیت سے میرا جواب تھا ''میرے پاس گاڑی نہیں ہے''۔ اگلے مرحلے میں اعداد کی وضاحت کے بعد استاد نے پوچھا ''تمہارے پاس کتنی گاڑیاں ہیں''؟ میرا جواب پھر وہی تھا ''میرے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے''۔ اب استاد حیران رہ گئی۔ انہوں نے پوچھا ''پھر آپ دفتر کیسے جاتے ہیں''؟ میں نے کہا ''پیدل''۔ یہ سن کر وہ اور بھی حیران ہوئیں۔ ''آپ پیدل دفتر کیسے جا سکتے ہیں دفتر کتنی دور ہے''؟ میں نے کہا ''میرے گھر کے پیچھے ہی ہے''۔ اُن کے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل تھا کہ ہمارے پاس دوسوا یکڑ پر مشتمل ایک وسیع کیمپس موجود ہے جہاں رہائشی سہولیات اور مہمان خانوں کا انتظام بھی ہے۔ مگر اُس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ خصوصیت بیرونِ ملک سے آنے والے مہمانوں کو کم خرچ میں مدعو کرنے کے لیے ایک نہایت مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے کیونکہ ہم رہائش اور قیام کی سہولت خود فراہم کر سکتے تھے اور صرف سفر کے اخراجات اور معمولی اعزازیہ ادا کرنا کافی ہوتا۔ بعد میں آئی ایم پی میں بیرونِ ملک اساتذہ کو مدعو کرتے وقت میں نے اسی تصور سے فائدہ اٹھایا۔

(ت) لونا کی سواری

ایک مرتبہ میرے تحقیقی ساتھی نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ وہ پروفیسر بھی تھے اور ایم ڈی پی کے چیئرمین بھی یعنی ادارے میں نہایت باوقار حیثیت رکھتے تھے۔ ہم نے شام پانچ بجے پارکنگ ایریا میں ملنے کا طے کیا۔ میں وقت پر پہنچ گیا مگر اُن کی گاڑی نظر نہ آئی۔ کچھ دیر بعد میں نے اُن کی آواز سنی۔ دیکھا تو وہ ایک چھوٹے سے موپیڈ ''ہندوستان کی لونا'' جیسی کے ساتھ کھڑے تھے جس میں پاؤں رکھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ میں ہل گیا کیونکہ مجھے توقع تھی کہ اُن کے پاس ایک عمدہ کار ہوگی خاص طور پر اس لیے کہ وہاں ٹاپسٹ اور پلمبر تک گاڑیوں میں سفر کرتے تھے۔ انہوں نے موپیڈ اسٹارٹ کی اور ہم تنگ گلیوں میں داخل ہو گئے۔ جہاں بھی ٹریفک ملتا وہ اپنی لونا اٹھا کر فٹ پاتھ پر چلنے لگتے۔ ایک جگہ ہمیں چھ لین والی مرکزی سڑک عبور کرنی تھی جہاں دور تک ٹریفک جام تھا مگر انہوں نے دوبارہ اپنی لونا اٹھائی اور ہم آرام سے سڑک پار کر گئے۔ ہم اُن کے شاندار گھر پہنچے جہاں چائے پینے کے بعد رات تقریباً ساڑھے آٹھ بجے باہر کھانے کے لیے تیار ہونے لگے۔ جب ہم نیچے آئے تو انہوں نے گیراج کھولا اور میں نے وہاں ایک خوبصورت Mercedes-Benz دیکھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ ٹریفک جام کی وجہ سے اپنی خوبصورت گاڑی دفتر نہیں لا سکتے تھے اور اسے صرف دفتری اوقات کے بعد ہفتہ وار تعطیلات یا سیر و تفریح کے لیے استعمال کرتے تھے۔

Vehicle Density Over the Years (2W Equivalent)

200.00

150.00

100.00

50.00

0.00 1951 1961 1971 1981 2001 2011 2015

میں سوچنے لگا کہ اسپین کے مقابلے میں ہندوستان کی آبادی بیس گنا زیادہ ہے جبکہ رقبہ صرف چھ گنا بڑا ہے۔ اگر ترقی کے نام پر ہم نے عوامی نقل وحمل کے متبادل نظام پر توجہ نہ دی اور صرف کاروں اور دوسری موٹر گاڑیوں پر انحصار کرتے رہے تو کیا ہمیں بھی اسی نوعیت کے بحران کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا؟

آخر کار صرف پچیس برس بعد یہی بات سچ ثابت ہوئی اور آج ہم شدید ٹریفک بحران اور اس سے جڑے آلودگی کے مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔

(ٹ) بندرگاہ پر کرنسی کا تجربہ

دسمبر میں برطانیہ کے سفر کے دوران میں نے ESSEC,Erasmus اور مانچسٹر بزنس اسکول کا دورہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس سفر میں مجھے بیلجیم سے بھی گزرنا تھا اور وہاں ایک رات قیام کرنا تھا۔ اس طرح میرے پاس پانچ مختلف کرنسیاں تھی، ہسپانوی پیسیٹا، فرانسیسی فرانک، بیلجین فرانک، ڈچ گلڈر اور برطانوی پاؤنڈ اور ہر تبادلے پر کرنسی ایکسچینج کا نقصان الگ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ۱۹ دسمبر کو روٹرڈیم سے لندن جاتے ہوئے جب میں اینٹورپ کی بندرگاہ پہنچا تاکہ انگلش چینل عبور کر سکوں تو رات کے تقریباً دس بج رہے تھے اور سخت سردی تھی۔ درجہ حرارت تقریباً 25 فارن ہائیٹ (5- سینٹی گریڈ) تھا۔ میں نے سوچا کہ ایک کپ کافی پی جائے جس کی قیمت ۴۰ بیلجین فرانک تھی۔ میرے پاس ۵۰ فرانک تھے سو کی میں نے کافی خرید لی۔ رات کا کھانا نہ کھانے کی وجہ سے مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں نے ایک بن اور مکھن لینے کا سوچا جس کی قیمت مزید ۴۰ فرانک تھی۔ اب میرے پاس صرف ۱۰ فرانک بچے تھے اس لیے میں نے دکاندار سے پوچھا کہ کیا میں پاؤنڈ میں ادائیگی کر سکتا ہوں؟ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے اسے ۱۰۰ پاؤنڈ کا نوٹ دے دیا۔ اُن دنوں ایک پاؤنڈ تقریباً ۶۵ بیلجین فرانک کے برابر تھا۔ اُس نے حساب لگا کر تقریباً ۶۵۰۰ فرانک بنائے اس میں سے کچھ ایکسچینج کمیشن اور ۴۰ فرانک کی قیمت منہا کی اور باقی رقم ۶۱۱۲ فرانک واپس کر دی۔ میں نے کہا ”اب میں ان فرانکس کا کیا کروں گا جبکہ میں برطانیہ جا رہا

ہوں؟ کیا آپ باقی رقم پاؤنڈ میں واپس نہیں دے سکتے‘‘؟ اس نے جواب دیا ضرور۔ ” پھر اس نے مزید ۵.۵ فیصد ایکسچینج کمیشن کاٹ کر مجھے صرف ۸۹ پاؤنڈ واپس کیے۔ اس طرح آدھے پاؤنڈ کی چیز خریدتے ہوئے میں چند سیکنڈ میں دس پاؤنڈ گنوا بیٹھا۔ ہر کرنسی تبادلے پر اس طرح نقصان اٹھاتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ ہندوستان میں ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ ایک ہی کرنسی کے ساتھ مغربی یورپ جتنے وسیع خطے میں سفر کے برابر فاصلہ طے کر سکتے ہیں اور ایک پیسہ بھی کرنسی ایکسچینج میں ضائع نہیں ہوتا۔

سردیوں میں صفر سے منفی بیس ڈگری سینٹی گریڈ تک درجہ حرارت، بارش اور دن میں صرف چند گھنٹوں کے لیے دستیاب سورج کی روشنی نے مجھے اس بات پر غور کرنے پر مجبور کیا کہ لوگ زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ٹیکنالوجی کو کس قدر دشوار حالات میں ترقی دیتے ہیں۔ کیا وہ بجلی کا بند ہونا برداشت کر سکتے ہیں؟ ہندوستان میں ملک کے بیشتر حصوں میں سال کے دس سے بارہ مہینے تقریباً بارہ گھنٹے سورج کی روشنی میسر رہتی ہے اور صفر سے ۴۵ ڈگری سینٹی گریڈ تک درجہ حرارت اتنا معتدل ہوتا ہے کہ ہمیں پورا سال گھروں کے اندر زندگی گزارنے کے لیے غیر معمولی انتظامات کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جو چیز ہمارے لیے آسائش ہے وہاں وہ ضرورت ہے۔ ہمارے لیے ایئر کنڈیشننگ کا مطلب ٹھنڈک ہے جبکہ وہاں اس کا مطلب گرمی فراہم کرنا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہندوستان میں دوپہر بارہ بجے کا تصور امریکہ میں اسی وقت کے مفہوم سے مختلف محسوس ہوتا ہے۔

ایک مشکل ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرنے میں بھی تھی ان ممالک کے سفر کے لیے مجھے اسپین، فرانس، بینیلکس (بیلجیم، نیدرلینڈز اور لکسمبرگ)، جرمنی اور برطانیہ کے الگ الگ ویزے حاصل کرنا پڑے۔ ہر سرحد عبور کرتے وقت امیگریشن کے مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ پاسپورٹ یا ویزا کھو جانا نہ صرف قیام کو خطرے میں ڈال سکتا تھا بلکہ ایسی صورت میں انسان قانونی مشکلات میں بھی پھنس سکتا تھا، اور وہاں کوئی مددگار بھی نہ ہوتا۔ جب میں ہندوستان میں بغیر کسی رکاوٹ کے ۲۹ ریاستوں (جن میں سے چار ریاستیں آبادی کے لحاظ سے یورپی یونین کے سب سے بڑے ملک سے بھی بڑی ہیں) اور ے مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں سفر کرتا ہوں اور موجودہ یورپی یونین سے تقریباً چار گنا زیادہ آبادی والے خطے میں گھومتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ گویا میں پورا یورپ گھوم آیا ہوں نہ بٹوے میں کرنسی تبدیل کرنی پڑتی ہے نہ امیگریشن سے گزرنا پڑتا ہے نہ پاسپورٹ ساتھ رکھنا ہوتا ہے اور نہ ویزا۔

تاہم جو بات تکلیف دیتی ہے وہ یہ ہے کہ آبادی کے اعتبار سے (یعنی انسانی ذہانت کے اس خدائی عطیے کے لحاظ سے) امریکہ یا یورپی یونین سے تقریباً چار گنا بڑا ہونے کے باوجود ہندوستانی معیشت اُن کی معیشت کے صرف ایک چھٹے حصے کے برابر ہے (امریکہ کے تقریباً ۴. ۱۳ فیصد اور یورپی یونین کے تقریباً ۱. ۱۵ فیصد کے برابر)۔ یعنی ہم شاید اپنی ممکنہ صلاحیت کے محض

چوبیسویں حصے تک پہنچ سکے ہیں جبکہ باہمی ہم آہنگی، مشترکہ قوت اور انسانی وسائل کی ترقی کے ذریعے اس سے کہیں زیادہ حاصل کیا جاسکتا تھا۔

بارسلونا کا یہ سفر میرے لیے ایک آنکھیں کھول دینے والا تجربہ ثابت ہوا۔ میں نے دریافت کیا کہ ہم ہندوستان میں کن معنوں میں ایک جنت جیسی زندگی گزارتے ہیں اور کن طریقوں سے ہم باہمی تعاون اور اشتراکی تعلقات کے ذریعے وسیع تر سماج کے فائدے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ بین الاقوامی تبادلہ اور علمی اشتراک ایک عظیم نعمت ثابت ہوسکتا ہے اور یہ کہ ممتاز مینجمنٹ اداروں کے ہر استاد کو کم از کم ایک سال کے لیے بیرونِ ملک جانا چاہیے تاکہ اس کے افق وسیع ہوں وہ اپنے ہی ملک سے نئی محبت کرنا سیکھے بہتری کے امکانات کو پہچانے اور دنیا کے لیے کچھ نیا تخلیق کر سکے۔